سچا اور اصل شاعر۔۔۔سرفراز آبد

سرفراز آبد صاحب کی شخصیت سے آشنائی اور ان کے کلام سے آگاہی ہوتے ہی انسان کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی شاعری ان کے ذاتی تجربات، مشاہدات کا بیان بھی ہے اور ان کی تخلیقی صداقتوں کا سچا عکس بھی۔

سچ کا اس سے بڑا اور برملا اظہار کیا ہوگا بھلا
زندگی ہے تو عشق بھی ہوگا
یہ علامت ہے زندگانی کی

بہت ہے اس میں رسوائی بہت ہے
ہمیں پر عاشقی بھائی بہت ہے

مجھے یاد نہیں پڑتا، کہاں یہ فقرہ نظر نواز ہوا مگر پروفیسر وارث کرمانی صاحب کے حوالے سے کسی نے لکھا، شعرا گر سچا اور اصل ہو تو اس کی سادگی میں زمانے کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں۔

میں تین شعر آپ کے ذوق کی نذر کرتا ہوں۔ ان کی سادگی میں زمانے کروٹیں لیتے دیکھئے۔

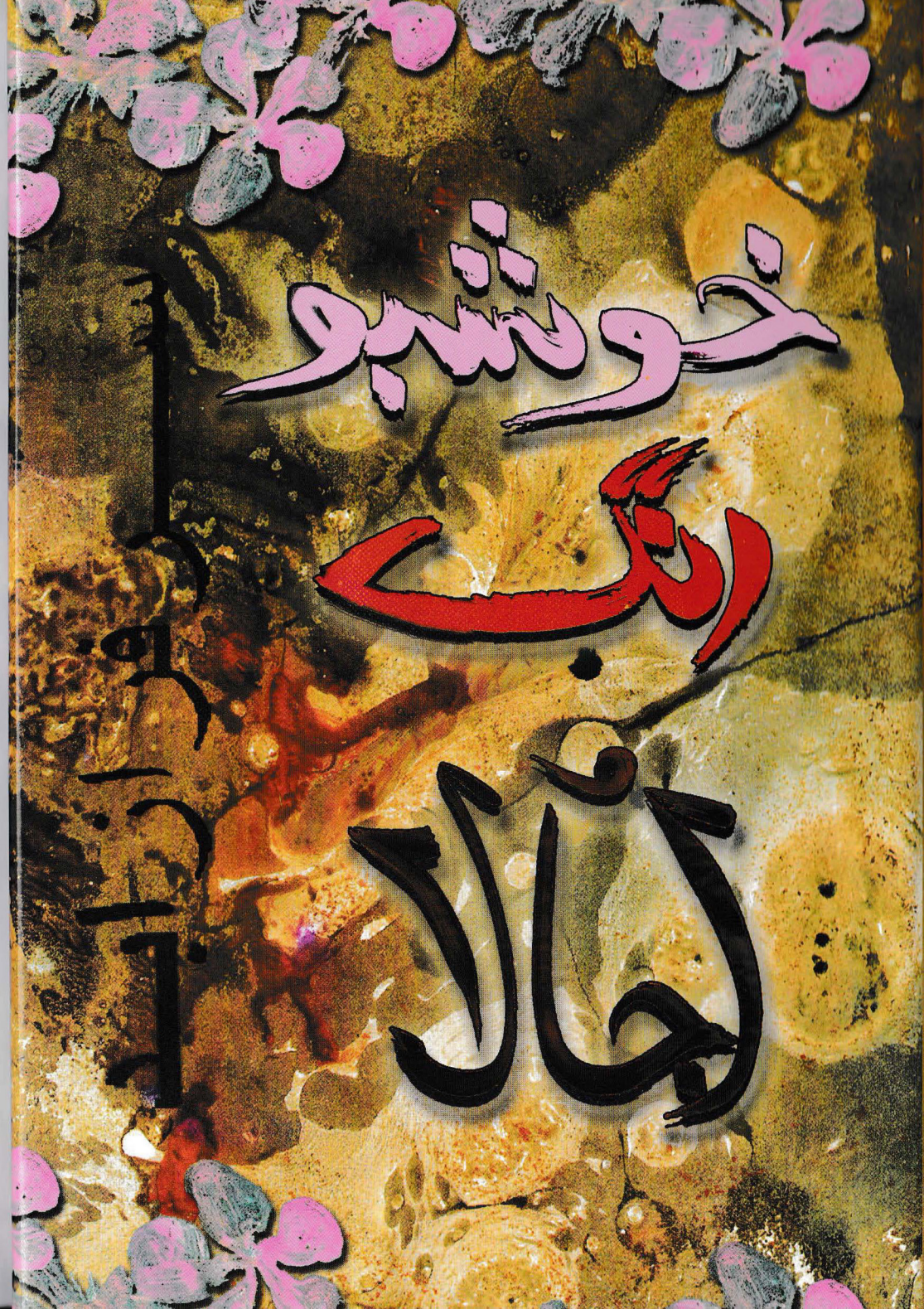

ذوقِ فنا ہے اصل زیست، سوز نہاں بقائے زیست
عشق کی طبعِ خود پسند حسن کے ناز اٹھائے کیوں

مرض عشق نے بخشا ہے تحفظ مجھ کو
اب مجھے کوئی بھی آزار نہیں ہوسکتا

سکھا رہی ہے ہمیں کیا مزاج کوزہ گری
بھنور کے چاک پہ ہم زندگی بناتے ہیں

حلم، علم، متانت، رواداری، کیسی کیسی خوبیوں کا مرقع ہے سرفراز آبدؔ کی شخصیت۔

مشرقی روح اور تہذیبی مزاج رکھنے والے سرفراز آبدؔ کو صحیح معنوں میں محبتوں کا پیامبر کہا جاسکتا ہے۔ میں یہاں انہیں فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کر رہا، اعلیٰ انسان ہونا میرے نزدیک فرشتہ ہونے سے آگے کی بات ہے۔

سرفراز آبدؔ کا شعر دیکھئے۔

آدمیت کا سزاوار نہیں ہوسکتا
ایسا انساں جو گنہگار نہیں ہوسکتا

عمر کے ابتدائی حصہ میں جو ادبی ماحول سرفراز آبدؔ کو میسر آیا اس سے بہتر تربیت گاہ کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے والد محترم حضرت شفقؔ اکبر آبادی دنیائے ادب میں ایک معتبر اور محترم نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے استاد محترم جناب فداؔ خالدی دہلوی ایک اور معتبر ادبی شخصیت اور استاد شاعر جنہوں نے شاعری کے دشتِ خاردار میں ان کی رہنمائی کی شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی ادبی محفل ہو، شاعروں کے جمگھٹے میں

سرفراز آبدؔ علیحدہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شعری وراثت ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ان کے لئے اور کیوں نہ ہو۔ ایسی تربیت کے ساتھ ساتھ سرفراز آبدؔ کا عمیق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے کی وسعت ان کی شاعری کو اعلیٰ درجہ کی شاعری بناتی ہے۔ ان کے ہاں نہ تو ہیئت کے کمالات دکھانے کا جنوں ہے اور نا ہی مشکل الفاظ کی غیر ضروری بھرمار۔ وہ تو بس محبت اور انسان دوستی جیسے جذبوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی شاعری کے ذریعے خوش گفتاری کرتے ہوئے فکر و فن کے جادو جگاتے چلے جاتے ہیں۔

تم جب آئینہ دیکھتے ہوگے
آئینہ تم کو دیکھتا ہوگا

کتنی عریانیوں کا پردا ہے
غربتِ شب کی تیرگی گویا

خواہشوں میں گھرا ہی رہتا ہے
آرزو مند بے وسائل دل

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس خوش گفتاری اور لطافتِ بیان کے ساتھ کہیں کہیں افکار مضطرب کی لہریں بھی موجزن دکھائی دیتی ہیں۔ سادگی اور سچائی، سرفراز آبدؔ کی شخصیت کی ایک اہم پہچان ہے۔ ویسے بھی سنتے آئے ہیں کہ انسان کی شاعری اس کے اندر کی سچائی کا عکس ہوتی ہے۔

ہم نے سچائیوں کی قیمت پر
دشمنی مول لی زمانے سے

ممکن ہے شاعری کا ایسا جنوں پہلے بھی کبھی رہا ہو لیکن آج کل کچھ تو ایسے لگتا ہے جیسے ہر شخص نثر لکھتا ہو یا نہیں لیکن شعر ضرور کہتا ہے۔

فیس بک کی حد تک تو دباؤ کو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن اب تو شاعروں کی صورتِ حال بھی خاصی تشویشناک ہو چکی ہے۔

سرفراز آبدؔ ایسے اصل شاعر کے لئے یہ سب کچھ جان پر سہہ لینا کچھ اتنا آسان نہیں ہے

جو چاہو اب سر محفل سنا دو
ستم کیا، شعر بھی سہنے لگے ہیں

اب ہر دکانِ اہل نظر بند ہو گئی
دنیا میں کاروبار ہنر ختم ہو گیا

ذوقِ سلیم کی نعمت سے مالا مال، آداب شعر سے مکمل طور پر واقف اور سلیقے سے بات کہنے کا ڈھنگ جاننے والے سرفراز آبدؔ سے حرف کی بے حرمتی برداشت نہیں ہوتی۔

شعر لکھتے ہیں آبدؔ اس لئے شرمندہ ہیں
لوگ قائل ہیں یہاں، قافیہ پیمائی کے

اور

منتہی سب ہیں مانتے ہیں آبدؔ
ایک ہم ہی ہیں مبتدی گویا

سرفراز آبدؔ کی شاعری ہماری روایتی شائستگی اور تہذیب کی شاندار مثل ہے۔ وہ تہذیب جو اب کم کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں ہماری ادبی تاریخ کے ماہ و سال بولتے ہیں۔

بے خودی میں تری تصویر بنالی میں نے
کس قیامت کے یہ خط دستِ ہنر سے نکلے

اب کوئی رازِ غمِ زیست کا پنہاں نہ رہا
صورتِ شیشہ حیراں ہیں برس کر آنکھیں

یہ دو اشعار دیکھئے۔ ہماری تہذیبی اقدار مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

وہ بے نقاب سہی میرے روبرو لیکن
حجاب پھر بھی بہت درمیاں میں رہتے ہیں

سخن ہزار ہیں ویسے تو گفتگو کے لئے
زباں ہے بند مگر تیری آبرو کے لئے

یہاں میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ سرفراز آبدؔ کی شاعری میں حسن و عشق کا بیان روایتی انداز کا نہیں بلکہ عصرِ حاضر کی محبتوں کے سلسلوں کا عکاس ہے۔ سرفراز آبدؔ کی شاعری میں حسن و عشق کے معاملات محبت کے تعلق کی وسعت، گہرائی اور سنجیدگی سے عبارت ہیں۔

حل جنہیں کوئی کر نہیں سکتا
پیدا کرتا ہے وہ مسائل دل

کیا خبر حسن و عشق کے مابین
اور کب تک رہے گا حائل دل

ان کے عشق کی داستان میں وصال کی سیرابی سے زیادہ وارفتگی کا بیان ہے۔

مجھ کو معلوم نہ تھا وصل کا ہنگام ہے یہ
میں تو بس سُن کے اذانِ دل مضطر جاگا

شبِ وصال کی نسبت، شبِ فراق کی کیفیت کہیں زیادہ ہے

بدلے موسم، بگڑی دنیا اور نہ جانے کیا کیا کچھ
ہجر کے اس عالم میں ہوگا اور نہ جانے کیا کیا کچھ

سرفراز آبدؔ جیسا دردمند دل رکھنے والا احساس انسان جس ماحول میں سانس لے رہا ہوتا ہے اُس کا اثر قبول کئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ اس لئے یادِ ماضی، ہجرت، تعصب، عدم تحفظ، بے عملی کا بنجر پن ہوسِ مال و زر، لمحۂ موجود کی ناآسودگیاں، غیر انسانی رویہ، غربت کا عذابِ مسلسل، اعلیٰ اقدار کی پامالی، انسان کی بے حسی اور کردار کی زبوں حالی جیسے موضوعات ان کی شاعری میں در آتے ہیں۔ اپنے اردگرد زندگی کی تمام تر ناکامیوں، حسرتوں اور تلخیوں کو وہ اپنی شاعری میں سمیٹ لیتے ہیں اور اس کمال کے ساتھ کہ حالات کی ہنگامہ پروری اور غیض و غضب، سرفراز آبدؔ کے اظہار میں کہیں راہ نہیں پاتے۔

وہ بہت سادگی، سچائی، قرینے اور احتیاط کے ساتھ ان موضوعات کو برتتے ہیں اور یوں اپنے مانوس، صحت مند اور متوازن رویے کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے

قاری اور سامع سے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی مسلسل شکست و ریخت اور انسانی اقدار سے ہماری نسلِ نو کی بے بہرگی انہیں تڑپاتی بھی ہے اور رلاتی بھی ہے۔

اخلاص و مروت، ادب آداب کی باتیں
تعبیر سے محروم ہیں یہ خواب کی باتیں

دردمند دل رکھنے والے سرفراز، غیر انسانی رویے، انسانی بے حسی کا برتاؤ اور ناقدریٔ احباب دیکھتے ہیں تو بے اختیار شکایت لبوں تک آجاتی ہے۔

اک درد بھرا دل ہے مرے پاس تو کیا ہے
اس جنس کی دنیا میں ضرورت ہے بہت کم

مشینی طرز زندگی میں مصلحت پسندی، ریاکاری، منافقت اور خودغرضی جیسے جذبات و احساسات پروان چڑھتے ہیں اور دوست سے دشمن بہتر نظر آنے لگتا ہے

کیا بنائے ہیں دوست تم نے آبدؔ
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

اور

بہت محتاط ہوں میں دوستوں سے
مجھے دشمن سے کچھ خطرہ نہیں ہے

ایک تلخ سچائی کا بیان دیکھئے

جب بھی اے دوست ترا کام نکل جاتا ہے
تیرے دفتر سے مرا نام نکل جاتا ہے

ایسے میں مذہبی سیاستدان، دوستوں سے بہت مختلف نظر آتے ہیں

آج کے مفتی و واعظ سے جو سنتا ہوں خطاب
دسترس سے مری اسلام نکل جاتا ہے

ہجرت سرفراز آبد کے لئے محض ایک لفظ یا ایک تصور نہیں ہے بلکہ وہ ذاتی تجربہ ہے جس سے اب تک کی زندگی میں انہیں دوبار گزرنا پڑا۔ غیر منقسم ہندوستان کی آزادی اور پھر اس کی تقسیم سرفراز ابد کے والدین اور ان کی اپنی نسل کا مشترکہ تجربہ تھا۔ ایک ایسا ذاتی تجربہ جس نے انہیں کربناک اذیتوں سے گزارا۔ ایسا تجربہ جس میں انہوں نے انسانیت کو وحشت و بربریت میں بدلتے دیکھا۔ ہجرت کے اس تجربے کی بہت سی سچائیوں پر ۶۹ برس کی گرد پڑ چکی ہے۔ ہجرت کے اس تجربے میں بے شمار ٹیسیں ہیں، شکوے ہیں، آہیں ہیں، غیر منصفانہ سلوک کی داستانیں ہیں، خوابوں کی شکستگی ہے زندگیوں کا ادھورا پن ہے اور لاتعداد انسانی مجبوریوں کی داستانیں ہیں۔ یہ سب کچھ یادوں کے غار میں بند ہے جس کے دہانے پر کئی نسلوں نے بھاری پتھر رکھ چھوڑے ہیں۔

اب ہماری تیسری اور چوتھی نسلیں یہ بھاری پتھر سرکا کر بہت سی ان کہی کہانیوں اور داستانوں کو زبان دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس ہجرت عظیم کے حوالے سے میں سرفراز آبد کے صرف دو شعر یہاں پیش کر رہا ہوں۔ ان اشعار میں بہت سی داستانیں آپ کو مل جائیں گی۔

کتنی نسلوں کا خون باقی ہے
قرض ہجرت کا کب ادا ہوگا

ایک ہی گھر کے رہنے والوں میں
ایک سے دوسرا نہیں ملتا

مغرب کی جانب ہجرت معاش، سرفراز آبد کا دوسرا اور تازہ ترین تجربہ ہے۔

ہم پردیسیوں کا یعنی وطن عزیز سے دور بیٹھے لوگوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم کتنے ہی آسودہ حال کیوں نہ ہو جائیں، اپنے نئے وطن میں بھی ہمارے دل اُن ہی گلیوں کا طواف کرتے رہتے ہیں جن کی مٹی نہ صرف یہ کہ ایک عرصہ ہماری پہچان رہی ہے بلکہ ہم میں سے اکثریت کی شناخت آج بھی اسی مٹی سے ہے وہ مٹی جس میں ہمارا بچپن کھیلا اور جس میں ہمارے شعور نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ کراچی شہر پر برا وقت آیا تو وحشت و بربریت کی داستانوں نے جنم لیا۔ شہر بھر میں تعصب کے کم تر احساسات غلیظ پانیوں کے نالوں کی طرح اُبل پڑے۔

آدمی آدمی کے ہاتھوں اذیت ناکیوں کا شکار ہوا۔ منافقت اور ریاکاریوں کا کاروبار چمکا اور ایک بار پھر آدمیت کے چہرہ پر شیطانیت کی کالک مل گئی۔

سرفراز آبد نے سوال کیا

پی رہی ہے جو خون بیٹوں کا
کیا وہ دھرتی بھی ماں لکھی جائے

رہ رہ کے انہیں زیادہ دکھ ہوا تو اس بات کا

تعصّبات کا سیلاب بھی وہیں آیا
لگی تھی فصل محبت کی جن زمینوں میں

زندگی اور کاروبارِ حیات معطل ہوگیا

اب وہ نظروں میں مناظر ہیں کہ یارو ہم سے
اب بیان لب و رخسار نہیں ہوسکتا

اور

دامنِ گل سے بھی آنے لگی بارود کی بو
کام آسان نہیں اب چمن آرائی کا

دوست دشمن ہوگئے۔ کردار کی پسماندگی نے حدوں کو چھولیا۔ دوغلا پن اور ریاکاری زندگی کا معمول بن گئی اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا

وہ کس کے در پہ ہیں سجدہ گزار کیا معلوم
جو منتظر ہیں مرے خون سے وضو کے لئے

برے حالات کا تسلسل، منفی سوچ بلکہ ناامیدی کو جنم دیتا ہے سرفراز آبدؔ جیسی مثبت سوچ رکھنے والا بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

لگتا ہے زندگی کا سفر ختم ہوگیا
میں جس میں بس رہا تھا وہ گھر ختم ہوگیا

امید کے درخت بھی ویران ہوگئے
اب سب خیالِ برگ و ثمر ختم ہوگیا

لیکن بطور ایک رومانی شاعر اور تخلیق کار کے سرفراز آبدؔ اپنے آئیڈیل کو پانے کے لئے امید کا سہارا لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے لئے مستقبل، حال کی نسبت اہم

تر ہوتا ہے۔ اپنی آرزوؤں کو تکمیل پذیر دیکھنے کے خواہشمند، حال کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہیں۔

فطرت کا باغیانہ پن ہمیں تمام رومانوی شاعروں میں ملتا ہے گو کہ ان کی بغاوت کے درجات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

خوفِ جاں تیری اطاعت نہیں کرسکتا میں
ترک اظہار صداقت نہیں کرسکتا میں

اور

اس جرم کی پاداش میں آیا ہوں سرِ دار
اوروں کی طرح اس کو خدا کہہ نہ سکا میں

یہاں رومانیت سے میری مراد سطحی نوعیت کی وارداتِ حسن و عشق ہرگز نہیں بلکہ وہ خاص انداز فکر ہے جس کا عصر جدید میں قریب ترین حوالہ فیض احمد فیض صاحب ہیں۔

سرفراز آبدؔ دورِ حاضر کو زندگی کے حقائق اور ان سے جڑے ہوئے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا شعور ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ سرفراز کی تمام شاعری اصل میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے کا عمل ہے۔

وہ شعور کو اپنا رہنما بنا کر زندگی کو بامعنی بناتے ہیں لیکن وہ صرف حقائق کے ادراک اور تفہیم پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان حالات کو ایک نئی بہتر صورت دینا چاہتے ہیں۔

یہاں داخلیت اثر پذیر ہوتی ہے اور ایک آزاد، پرسکون مساوات، محبت اور امن کی بنیادوں پر قائم دنیا کا تصور انہیں اپنی جانب کھینچتا ہے۔ ایک نئی قسم کی بے

قراری جنم لیتی ہے اور یہی بیقراری مثبت تبدیلی کے لئے وجۂ تحریک بنتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وطن عزیز میں ذرا سی آسودہ صورتِ حال نظر آئی تو رت جگوں کے درمیان دیکھے ہوئے خوبصورت خوابوں کی دل کشا تعبیروں کے خواہشمند سرفراز آبد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

جو ہونا تھا ابھی تک وہ ہوا نہیں
تھمی برسات پر مطلع کھلا نہیں

اجالا ہو گیا کچھ تیرگی میں
چراغوں سے اندھیرا تو چھٹا نہیں

بہت کچھ لکھ چکا ہوں میں بھی لیکن
جو لکھنا ہے ابھی تک وہ لکھا نہیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ نا آسودگی، نئے افق کی تلاش کا استعارہ بن جاتی ہے جس سے فکر و عمل کے جذبات جنم لیتے ہیں اور مثبت سوچ منظروں کو اجال دیتی ہے۔

تمام شہر میں تاریکیاں ہیں یہ بھی نہیں
کہیں کہیں تو اجالا دکھائی دیتا ہے

لیکن یہ تکمیل آرزو نہیں ہے۔

طلوع صبح کے آثار نظر آتے ہیں تو ذہن و دل وسوسوں کے شکار ہونے لگتے ہیں۔

طلوعِ حسن گلستان ہے دیکھئے کیا ہو
بہار چاک گریباں ہے دیکھئے کیا ہو

ایک اور بات جو سرفراز آبد کو آئیڈیل مستقبل کے سلسلے میں پریشان رکھتی ہے وہ نسل نو کی نظامِ کار سنبھالنے کی عدم اہلیت ہے جس نسل کے درخشندہ مستقبل کے لئے وہ خواب دیکھتے ہیں اور جس نسل کو آسودہ اور نئے جہانوں کی دریافت کے لئے ان کا شاعرانہ اضطراب انہیں بے چین رکھتا ہے۔ اس کو سرفراز آبد پہلا سبق یوں دیتے ہیں۔

کیا مانگتے پھرتے ہو، پھیلائے ہوئے دامن
کشکولِ گدائی میں توقیر نہیں ملتی

اور ایک زندہ حقیقت

زندہ رہنے کا حق ملے گا اسے
جس میں مرنے کا حوصلہ ہوگا

وطن عزیز کے باسیوں کے لئے ایک شہر کا تصور خوابِ مسلسل ہے سرفراز آبد کے لئے وہاں کے باسیوں کے لئے مساوات، اخوت، امن و آشتی کے خواب دیکھنا ان کی ضرورت، تکمیل آرزو کی شدید خواہش ہی تو ہے جس نے یہ شعر کہلوایا ہے سرفراز آبد سے

ہمارے ہاتھ میں نظم چمن تو آنے دو
مجال کیا کہ گلستاں سے پھر خزاں گزرے

از جنبشِ قلم
تاشی ظہیر